مدارس کا نصاب کیا ہو؟

مولانا مفتی محمد زبیر حق نواز
استاذ جامعہ دار العلوم کراچی

امت کے اہل بصیرت عرصہ سے دینی مدارس کے موجودہ نصاب میں تاریخ، سیرت طیبہ، جدید فلسفہ، معاشیات، زبان دانی اور تصوف کے مضامین کے اضافہ کی بھرپور ضرورت محسوس کرتے اور اس کے متمنی رہتے ہیں اور وفاق المدارس کے اکابر اسی ضرورت کے پیش نظر تبدیلیاں کرتے بھی رہتے ہیں۔ تاہم جو بھی تبدیلیاں کی جارہی ہیں وہ درست اور عمدہ ہونے کے باوجود معروضی حالات کی روشنی میں موجودہ نصاب میں اندرونی اور جزوی تبدیلیاں ہیں۔ ہم آج کی نشست میں اپنے بعض اکابر کے ایک الگ مستقل نظریہ تعلیم کی طرف اشارہ کئے دیتے ہیں۔ یہ نصاب تعلیم میں ایک ملکی سطح کی تبدیلی ہے، جس کے نفاذ کی صورت میں اس کا زیادہ اثر مدارس کی بجائے اسکولوں اور کالجوں پر پڑے گا۔

ذیل میں ملکی سطح پر نصاب تعلیم سے متعلق جو رائے تحریر کی جارہی ہے، وہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی رائے ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ کی بھی کئی تحریرات میں، ان کے ذہنی طور پر اس نظریۂ تعلیم سے متفق ہونے کے کئی صریح اشارے ملتے ہیں نیز دیگر کئی اکابرِ امت نے بھی مختلف پیرایوں میں، مختلف مقامات اور کتب میں اصلاً اور کئی جگہوں میں ضمناً اسے بیان فرمایا ہے۔ بلکہ یہ رائے تو شاید سب کی ہے لیکن اس کی تفصیلات یا موجودہ دور میں اس کا قابل عمل یا ممکن العمل ہونا وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر تردد اور اختلاف ہوسکتا ہے۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ اپنے وقت کے جلیل القدر جید عالمِ دین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کئی میدانوں میں بڑا کام لیا، ٹھوس علمی استعداد کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تدوین حدیث وفقہ، سیرت طیبہ، اسلامی معاشیات وغیرہ علوم میں گہری واقفیت وبصیرت عطا فرمائی تھی۔ اس سلسلے میں آپ کی تصانیف میں سے دیگر کتب کے علاوہ ''تدوین حدیث، النبی الخاتم، تدوین فقہ، اسلامی معاشیات، اسلام کا نظام تعلیم وتربیت'' وغیرہ علمی حلقوں میں آپ کی یادگار کتابیں ہیں۔

ذیل میں حضرت مرحوم کے نظریۂ تعلیم کو بیان کرنے کا مقصد اس کے ممکن العمل یا ناممکن العمل ہونے سے قطع نظر اس پر سوچ وبچار اور غور وفکر کی دعوت دینا ہے، اس نظریہ کی صحت یا عدم صحت کا کوئی فیصلہ کرنا نہ مقصود ہے نہ

ہمارے لئے ممکن، یہ نظریۂ تعلیم کس حد تک درست، قابل عمل اور مقصود و مطلوب ہے؟ اس کی خوبیاں اور خرابیاں کیا ہیں؟ اس کے عواقب اور فوائد کیا ہو سکتے ہیں؟ یہ امت کے اہل علم وبصیرت کے سوچنے کا کام ہے، ہو سکتا ہے کہ ہمارے وہ دینی احباب جو اپنی تمام دینی وسیاسی پالیسیاں ہمیشہ معروضی حالات کی روشنی میں بنانے کے عادی ہو گئے ہیں ان کی نظر میں شاید اس نظریہ کا نفاذ ناممکن ہو، اور شاید ان کی نظر میں اس کے نفاذ کے لئے حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ جیسی تجدیدی شخصیات کی ضرورت ہو۔ اس کے علاوہ اس کا نفاذ وہ ناممکن سمجھتے ہوں تو انہیں یہ سوچنے کا اختیار ہے اور شاید یہ سوچ ان کی درست بھی ہو، تاہم اس کے باوجود اپنے ان اکابر کی کہی ہوئی بات ہی کو آج اپنے ہی اکابر اور ہمسفر دینی ساتھیوں کی خدمت میں پیش کرنا اور وہ بھی محض غور وفکر اور سوچ وبچار کے لئے کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

مولانا گیلانی مرحوم کے نظریۂ تعلیم کو بیان کرنے سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بنیادی طور پر علم ایک ’’اکائی‘‘ کا نام ہے۔ یہ تجزی وتقسیم کو قبول نہیں کرتا، علم کبھی اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اسے دنیوی، یا دینی نام سے یا عصری اور اخروی کے نام سے تقسیم کیا جائے، بلکہ علم ایک خاص اصطلاحی مفہوم میں ایسے لطیف جوہر کا نام ہے جو کسی قسم کی تفریق، تجزی وتقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ اگر حکمت اور فائدہ کی کوئی بات اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں موجود ہو تو وہ بھی علم میں داخل ہے اور بالفرض اگر کوئی غیر مفید یا غلط بات دینی مدارس کے نصاب میں موجود ہو تو وہ صرف اس وجہ سے ’’علم‘‘ میں شامل نہیں ہو سکتی کہ وہ دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ چنانچہ مولانا گیلانی رحمہ اللہ اپنا نظریۂ تعلیم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومت مسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں اس کی ’’دوئی اور اثنیت‘‘ کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے اس لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ’’نظریہ، وحدت نظام تعلیم‘‘ رکھا ہے، حکومت مسلطہ سے قبل مسلمانانِ ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا، اور عام طور پر ’’درس نظامیہ‘‘ کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے، اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان ’’فارسی‘‘ کی نظم ونثر وانشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب، خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعے دی جاتی تھی۔ ابتداء سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ، سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے، یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین، حدیث کے متعلق مشکوۃ اور فقہ کے سلسلے میں گو بظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ، لیکن ہدایہ کے ان

ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ علماً وعملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلباء جو کچھ پڑھتے تھے، فارسی یعنی دفتری زبان کی مذکورہ بالا بیسویں نظم ونثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی اور بعض ایسے عقلی وادبی علوم وفنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا جن میں صَرف، منطق وفلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی"۔

آگے فرماتے ہیں: "میں نے بزرگوں کے اسی طرزِ عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لئے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صَرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات ومسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان تین کتابوں کے معیار کے مطابق رکھتے ہوئے دنیاوی تعلیم کے مدارس کی تفریق کو ختم کر دیا جائے، میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے حکومت سے یہ استدعاء کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اب بھی اسی عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی، ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا، عالم وتعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا"۔

آگے حضرت مولانا گیلانی رحمہ اللہ نے اس نظریہ تعلیم پر طویل بحث کرتے ہوئے ہر قسم کے اشکالات کا نمبر وار جواب عنایت فرمایا ہے، اس میں سے صرف ایک شبہ یہاں ذکر کیا جاتا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا، اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر واختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے، میری گفتگو صرف عام لزومی واقفیت تک محدود ہے، اوپر ذکر کئے گئے ماضی کے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت مناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا، اس کے متعلق مذکورہ نظریہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان تین

کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت و مناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔

باقی تبحر و اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لئے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی، جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے، وہی طرزِ عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں، بلکہ طبعاً اختیار کرنا چاہیے۔

یہ ہے حضرت مولانا گیلانی کے نظریۂ تعلیم کا خلاصہ، اس نظریہ سے متعلق تمام تفصیلات، طریقۂ کار، شبہات اور اس کے جوابات کے لئے حضرت مولانا کی کتاب ''اسلام کا نظام تعلیم و تربیت'' اور مولانا سید ابوالحسن میاں ندوی رحمہ اللہ کی کتاب ''پا جا سراغ زندگی'' اور ''حدیث پاکستان'' ملاحظہ فرمائیں، کیونکہ اس مختصر تحریر میں اس نظریہ کے اہم اور ضروری پہلو سامنے لانا بھی مشکل ہے۔

اس نظریہ سے ضمناً ایک دو باتیں یہ سمجھ میں آتی ہیں کہ مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم مولانا مرحوم کی نظر میں دینی علوم میں اختصاص پیدا کرنے کے لئے ایک مکمل اور کافی نصاب ہے اور مدارس کا بنیادی طور پر مقصد بھی یہی ہے۔ تاہم اس نظریہ کی روشنی میں اصل بنیادی طور پر اسکولوں وغیرہ کے نصاب کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور ان کو تبدیل کرنے میں مدارس کو ان کی مدد کے طور پر آگے بڑھنا ہوگا، لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ یہ اصل تبدیلی اسکولوں میں کرنے کی ضرورت ہے، ڈھانچہ اس کا تبدیل کرنا چاہیے، چنانچہ مولانا گیلانی رحمہ اللہ نے اسی کتاب میں ایک جگہ یہ بات لکھی ہے کہ اس نظریہ سے مقصود مدرسہ کو اسکول یا کالج بنانا نہیں بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ برمحل ہوگا کہ اسکول اور کالج کو مدرسہ بنانا ہے۔

اور راقم کی نظر میں آج کے حالات میں جب آئے دن حکومت کی طرف سے مدارس کے نصاب میں ترمیم و تبدیلی کی باتیں کی جاتی ہیں، ایسے میں ہمیں خود آگے بڑھتے ہوئے اقدامی طور پر اسکولوں اور کالجوں میں تبدیلی کی مذکورہ بات بھرپور طور پر آگے بڑھانی چاہیے۔ خاص طور پر ایسے حالات میں کہ جب حکومت اپنے ہی منظور شدہ نصاب کو پڑھانے پر مجبور کرنے کے لئے راہ ہموار کر رہی ہو اور پھر یہ نظریہ کوئی حکومتی اقدامات کے مقابلہ میں ''جواب آں غزل'' اور الزامی طور پر اختیار نہ کیا جا رہا ہو، بلکہ بقول مولانا گیلانی رحمہ اللہ مسلمانوں کی دین سے بے تعلقی اور ان کے تعلیمی المیوں اور بربادیوں کا یہی سب سے کارگر علاج ہے۔

نیز ابتدائی دینی مدارس کو بایں وجہ اس نظریہ کی روشنی میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی کہ مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم ایک دفاعی نصاب تعلیم ہے، جب انگریزی سامراج نے ہندوستان پر اپنا جابرانہ تسلط قائم کیا تھا تو

مسلمانوں کو ہر اعتبار سے تباہ کرنے کیلئے ان کے دینی اقدار اور شعائر کو تباہ کرنے اور ان سے دینی تعلق چھیننے کا فیصلہ کیا گیا تھا، ایسے میں اکابر دیوبند نے دفاعی طور پر اس وقت کے تقاضوں اور ضرورت کے مطابق یہ دفاعی نصاب تعلیم بنایا تھا کہ کم از کم مسلمانوں کا خالص دین کسی طرح محفوظ کرلیا جائے اور یہ فیصلہ اس وقت کے حالات کے مطابق بالکل موزوں اور برمحل تھا۔ تاہم بعد میں بھی معروضی حالات کی روشنی میں بنائے گئے اسی قدیم نظام پر چلتے رہنا درست ہے یا نہیں؟ یہ مقام غور وفکر ہے کہ وہ دفاعی نصاب عارضی تھا یا مقصودی؟

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تمام خرابیوں کو وقتی اور معروضی حالات کے طور پر دھیرے دھیرے قبول کیا ہے، مروجہ جمہوری سیاست میں ہم یہ کہہ کر داخل ہوئے ہیں کہ جب تک بنیادی طور پر پورے سسٹم میں تغیر وانقلاب پیدا نہیں ہوجاتا اور اس کی قوت وتیاری نہیں ہے اس وقت تک کے لئے مجبوری میں الیکشنی سیاست کو اختیار کرلیا جائے اس مجبوری کی حالت میں ہم داخل ہوئے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ ہمارے بعض دینی احباب نے آگے چل کر اسی جمہوری نظام کو ہی مقصود بنالیا اور جمہوری نظام کی بالادستی کے لئے اپنے کارکنان کو ہر قسم کی قربانیوں سے گریز نہ کرنے کی تلقین شروع ہوگئی، جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہر لمحے یہ بات ذہن میں رہتی کہ ہم نے یہ جمہوری نظام اھون البلیتین بڑی کے مقابلہ میں چھوٹی مصیبت کے طور پر اختیار کیا تھا، یہ مقصود ہرگز نہیں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج پچاس سال بعد بھی ہم وہیں پر ہیں، جب کہ اسلام کا ایک مستقل اور قابل عمل نظام سیاست موجود ہے، اسلام میں سیاست وخلافت کی پوری تاریخ موجود ہے یہی حال مسلمانوں کے عمومی نظام تعلیم کا ہے، دینی اور دنیوی کی تفریق عارضی طور پر اختیار کی گئی تھی اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا کہ اکابر کا اس ظالمانہ دور کے اعتبار سے وہ فیصلہ بالکل درست تھا تاہم اب آگے چل کر یہ سوچنا ضروری ہے کہ وہ ایک عارضی، ایمرجنسی اور دفاعی نظام تھا، اصل مقصودی نہیں کیونکہ اسلام کا نظام تعلیم دینی طور پر آگے لے جانے کے ساتھ ساتھ دنیوی طور پر بھی مسلمانوں کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

قرآن میں فطری طور پر عام انسانوں کے درمیان مومن وغیر مومن کی گئی ہے، اس کے بعد پھر مسلمانوں میں صالح اور غیر صالح کی تقسیم کی گئی ہے اور علمی طور پر عالم اور جاہل کی تقسیم کی تفریق کی گئی ہے لیکن قرآن اور تاریخ اسلام میں کہیں بھی دینی یا دنیوی تعلیم اور دینی عالم اور دنیوی تعلیم یافتہ یا مسٹر وملا کی تفریق کا کوئی تصور موجود نہیں ہے، یہ خود ساختہ اور مصنوعی تفریق وتقسیم مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک ہے، جس سے عام مسلمانوں کا دین اور اہل دین سے تن ڈھیلا اور کمزور ہوتا چلا گیا۔ تعلیمی طور پر اس کا عمومی حل کیا ہے؟ کسی ایک رائے پر ہرگز اصرار کئے بغیر سوچ وبچار کی غرض سے دیگر مختلف تجاویز کی طرح حضرات اکابر کی اس مذکورہ بالا تجویز کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، اور اس کی طرف بھی اپنی کم از کم سوچ وفکر کو مبذول کرنا مصلحین امت کا فریضہ ہے۔......☆☆